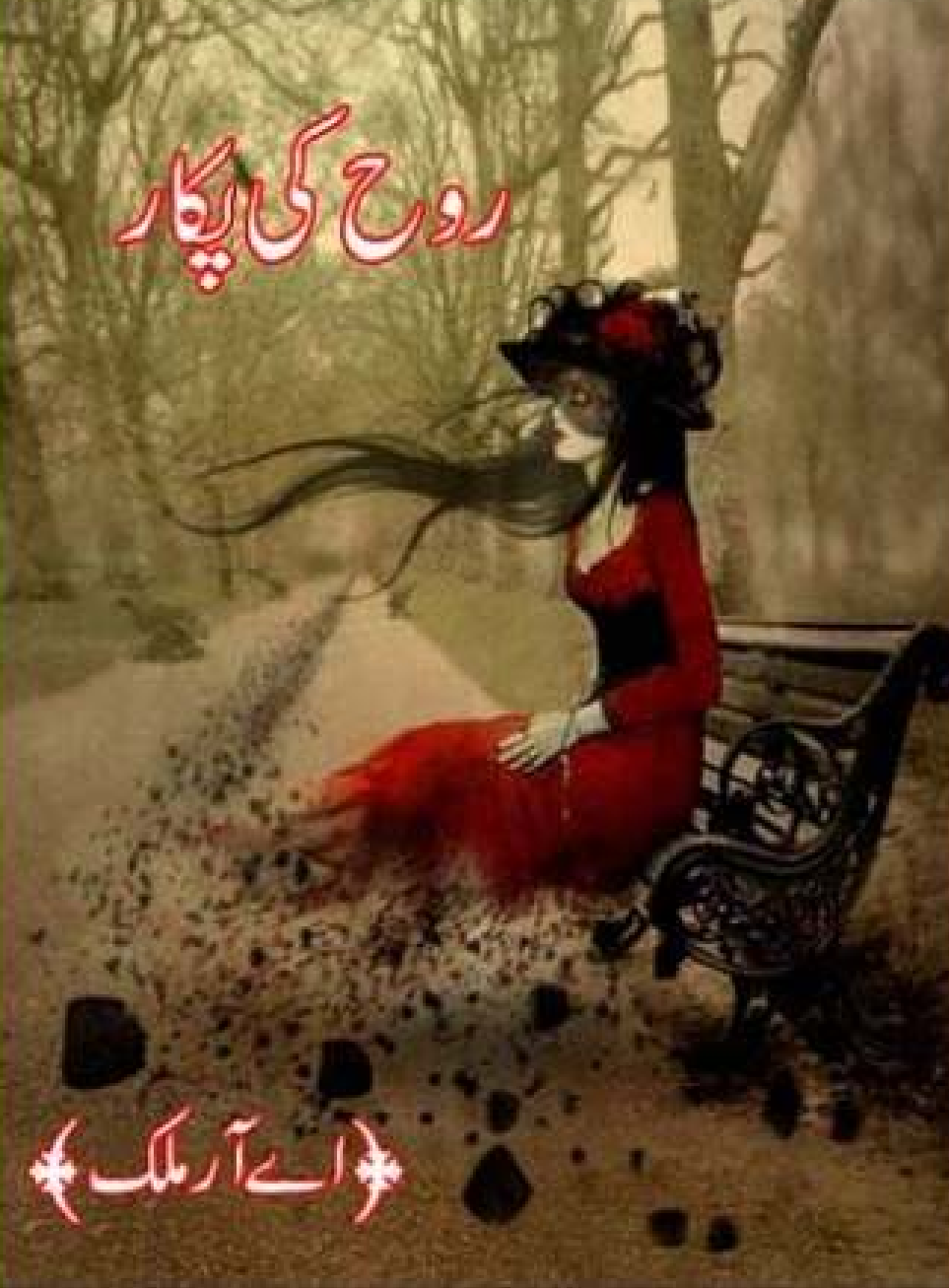

روح کی پکار
اے آر ملک

روح کی پکار

یہ جولائی 1960ء کا واقعہ ہے۔ میں اور انور، انجرا کے چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی سے اترے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہمارا گاؤں کوٹیرہ یہاں سے تقریباً چھ کوس پر تھا۔ انور کا خیال تھا کہ رات اسٹیشن پر گزاری جائے، لیکن میں مصر تھا کہ اسی وقت چلا جائے۔ آخر انور مان گیا اور ہم چل پڑے۔

انور اور میں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہ میرا نہایت گہرا اور رازدار دوست تھا۔ کچھ عرصہ قبل اسے ایک ایسا اندوہناک سانحہ پیش آیا تھا جس نے اس کے دل پر رنج والم کے گہرے نقوش ثبت کر دیئے تھے۔ اسے اپنے والد کے ایک مزارع کی لڑکی سکینہ سے محبت تھی۔ دونوں عمر بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیماں کر چکے تھے، لیکن روایات کے مطابق ان کی محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ وہ ایک معزز زمین دار کا

اکلوتا بیٹا تھا اور سکینہ کا باپ اس کا ایک غریب مزارع تھا۔ انور نے خاندانی وقار کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور سکینہ سے ملنا چھوڑ دیا۔ سکینہ کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ اس کے بعد انور نے والدین سے تعلقات توڑ لئے اور شہر چلا گیا۔ میں بھی ملازمت کے سلسلے میں شہر آیا اور ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔

میں نے چھٹی لے کر گاؤں جانے کا پروگرام بنایا تو انور کو بھی چلنے پر مجبور کیا۔ وہ اس شرط پر آمادہ ہو گیا کہ اپنے والدین کے ہاں نہیں جائے گا اور میرے گھر ٹھہرے گا۔ اس رات ہم پیدل چل پڑے تو ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انور نے ٹارچ جلائی اور اس کی محدود روشنی میں ہم پتھریلی زمین پر اپنے پاؤں کی چاپ سنتے، جلد جلد قدم اٹھا رہے تھے۔ راستے میں جا بجا ٹیلے تھے جن کے درمیان سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ہم دریائے سوہاں پر پہنچ گئے اور اس کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ ہمارے بائیں ہاتھ دریا تھا اور دائیں طرف اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ یہ دریا ضلع اٹک سے دریائے سندھ سے جا ملتا ہے۔

ہم خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک انور رک گیا اور کچھ سننے لگا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کانوں کے قریب کوئی سرگوشی کر رہا ہے۔ میں نے کہا، ہوا کی سائیں سائیں کرتی آواز ہے۔ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ میں نے بھی صاف طور سے محسوس کیا کہ میرے کانوں کے قریب شپ شپ کی آواز آ رہی ہے۔ میں رک گیا۔

انور بھی رک گیا اور اس نے ٹارچ کی روشنی پیچھے پھینکی۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ خدا کی پناہ! ہمارے پیچھے ایک عورت تھی۔ اس کا چہرہ اتنا خوفناک تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے اسے اپنا

واہمہ سمجھا اور آگے چل پڑے۔

تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ پھر شپ شپ کی آواز آنے لگی۔ انور نے ٹارچ کی روشنی پیچھے پھینکی تو پھر وہی چہرہ نظر آیا۔ ہماری حالت غیر تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔

جب وہ قریب آیا تو میں نے اسے سلام کیا، لیکن وہ سلام کا جواب دیئے بغیر پاس سے گزر گیا۔

میں بڑا حیران ہوا اور جب مڑ کر دیکھا تو سکتے میں رہ گیا۔ اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہمارا واہمہ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ہم کسی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔

اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو دادا جان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح ایک رات اس جگہ سے گزرے تھے تو انہوں نے دو کتے دیکھے، جو سامنے سے تیزی سے آتے اور ان کی ٹانگوں کے درمیان سے گزر جاتے۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا بہت سے لوگ اونٹوں پر ڈھول بجاتے آ رہے ہیں، لیکن وہ پاس سے گزرتے ہی غائب ہو گئے۔ میں نے اور لوگوں سے بھی سن رکھا تھا کہ فلاں جگہ سے آوازیں آتی ہیں فلاں جگہ سے روشنی نکلتی ہے، لیکن میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے قصے گھڑ رکھے ہیں۔ جسے لوگ پراسرار روشنی کہتے ہیں وہ دراصل فاسفورس کے جلنے سے پیدا ہوتی ہو گی۔

ہم دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ بڑی مشکل سے میری زبان سے نکلا کہ انور تمہیں کوئی قرآن مجید کی آیت آتی ہو تو پڑھو۔ انور بلند آواز

سے آیتیں پڑھنے لگا۔ رات کا وقت اور قرآن مجید کی تلاوت، ہمارا آدھا خوف تو جاتا رہا۔ اب ہمارا گاؤں ایک کوس کے فاصلے پر تھا اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انور نے تلاوت ختم کی۔ اچانک انور، انور کی آوازیں سنائی دی۔ یہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور یقیناً سکینہ کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسے سن کر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر یہ سکینہ کی بدروح نہیں ہے تو آواز دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے قدم مشکل سے اٹھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے من من کے ہو گئے ہوں۔ ہماری حالت اس وقت ایسی تھی کہ اگر کوئی گیدڑ بھی سامنے سے گزر جاتا تو شاید ہماری جان نکل جاتی۔

دفعتاً آواز بند ہو گئی اور ایسا دل خراش بین شروع ہوا کہ عام حالات میں اگر کوئی پتھر دل انسان بھی سن لے تو اس کے آنسو نکل آتے۔ ہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مبادا پیچھے رہ جانے کی صورت میں پہلے وہی پکڑا جائے۔ اسی طرح ڈرتے لرزتے، بدحواس گاؤں پہنچ گئے۔ ہمارا گاؤں ٹیلے پر واقع تھا۔ جب ہم اوپر چڑھ رہے تھے تو اچانک ہمارے پاؤں کے قریب چھوٹے چھوٹے پتھر آ کر گرنے لگے۔ کوئی پتھر بھی ہمیں نہ لگتا تھا، لیکن پاؤں تلے جو بھی آتا تو اتنے زور سے آواز پیدا ہوتی کہ ہم اچھل پڑتے۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے تو تقریباً بارہ کا عمل تھا۔ جلدی سے بستر میں دبک گئے۔ صبح ہوئی تو دونوں کو سخت بخار تھا۔ ہم نے رات کے واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔

اگلے روز تک ہماری طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ اسی رات کا ذکر ہے، میں اور انور اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں کافی رات گزر

گئی۔ اچانک میری نظر سامنے منڈیر پر پڑی۔ دیکھا کہ اس پر بہت ہی چھوٹے چھوٹے دو بچے کھیل رہے ہیں۔ انور نے بھی شاید انہیں دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ کہتا، وہ دونوں تیزی سے سیڑھی سے اترے اور ہماری طرف آئے۔ ایک بندر کی سی پھرتی سے میرے سینے پر چڑھ گیا۔ دوسرا شاید انور کی طرف چلا گیا۔ میرے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی، بس غوں غوں ہونے لگی۔ معماً میں نے دیکھا کہ جسے میں بچہ سمجھ رہا تھا وہ کوئی اور ہی مخلوق تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور لمبوتری تھیں۔ وہ میرے سینے پر بیٹھا کبھی سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتا، کبھی سونگھنے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے سینے پر سے اترا اور منڈیر کی طرف چلا گیا۔ اس اثناء میں دہشت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

صبح کے وقت مجھے ہوش آیا۔ انور ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سیڑھی کو منڈیر سے ہٹا دیا۔ کچھ دیر بعد انور ہوش میں آیا۔ ہم اُٹھے اور سیر کو نکل گئے۔ راستے میں انور نے رات کے واقعہ کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ میں تو آرام سے سویا۔ کہنے کو میں نے یہ کہہ دیا، لیکن میں خود بہت خوف زدہ تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ہم لوٹ رہے تھے تو اچانک انور چلتے چلتے رک گیا۔

"کچھ سنا تم نے؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے کہا۔ "مجھے تو ایسی آوازیں آ رہی ہیں جیسے کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا ہو۔ آواز بالکل اسی طرح کی ہے جیسے رات میں ہم نے سنی تھی۔" مجھے اس وقت کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ہنس پڑا۔ "بھئی تم بھی عجیب آدمی ہو! خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔

آخر تم اس رات کے واقعہ کو ذہن سے جھٹک کیوں نہیں دیتے؟"

گھر پہنچتے تک وہ یہی کہتا رہا کہ آوازیں آرہی ہیں اور میں اسے جھٹلاتا رہا، کیونکہ میں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

اس کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ میں نے محسوس کیا کہ انور اب تنہا رہنا زیادہ پسند کرنے لگا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی حرکات وسکنات دیکھتا رہا۔

ایک روز صبح ہی صبح اس نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔ "میں آج ہی واپس چلا جاؤں گا۔

"آخر ماجرا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا۔ "تم یقین نہیں کرو گے۔ لیکن میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔ سکینہ مجھے اکثر بلاتی رہتی ہے اور مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ ابھی ابھی جب تم سو رہے تھے تو سکینہ کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ وہ مجھے دریا کی طرف بلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں بے خودی میں چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ سکینہ سفید کپڑے پہنے دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف چل پڑی۔ میں کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے مجھ سے کافی باتیں کیں، لیکن مجھے صرف اتنا یاد رہا کہ آج رات میں تمہیں لینے آؤں گی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میرے علاوہ تم کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ اگر تم نہ آئے تو یاد رکھو، اس کا انجام تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور میں واپس چلا آیا۔

میں یہ سن کر سکتے میں رہ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا مرے ہوئے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔ انور کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ یہی سوچتے سوچتے شام ہو گئی۔

شام کو والد صاحب آئے تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی کیپٹن اقبال آئے ہیں۔ وہ صبح واپس چلے جائیں گے۔ ان سے مل آؤ۔ میں بہت خوش ہوا۔ ان سے چار سال سے نہیں ملا تھا۔ وہ میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کا گھر ساتھ والے گاؤں (سرہالی) میں تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ اس لئے میں جلدی سے تیار ہو گیا۔ انور بھی ساتھ ہو لیا۔ والد صاحب نے ایک نوکر ہمارے ساتھ کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر ہمیں خیال آیا کہ ٹارچ لانا بھول ہی گئے، چنانچہ نوکر ٹارچ لینے کے لیے بھیج دیا اور خود آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ آگے چل کر راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایک دریا کے کنارے سے اور دوسرا ٹیلوں پر سے۔ لیکن یہ دونوں راستے اسی گاؤں کو جاتے تھے۔

ہم نے فیصلہ کیا کے اوپر والے راستے سے چلتے ہیں (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، نوکر نچلے راستے سے گیا تھا) تھوڑی دور گئے تھے کہ میں نے دیکھا، سامنے کچھ فاصلے پر زمین سے چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں اور ان کی روشنی میں کئی ہڈیاں چمک رہی ہیں۔ اس جگہ پہلے قبرستان ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے ہم خوف زدہ ہو جاتے، لیکن میں جانتا تھا کہ یہ روشنی فاسفورس کی ہے جو ہڈیوں میں ہوتا ہے۔ ہم آگے بڑھتے رہے، اچانک مجھے اپنے بائیں طرف نقرئی قہقہے سنائی دیئے۔ ہم دونوں نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ تین خوبصورت لڑکیاں جن میں ایک سکینہ تھی، ہمیں دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ سکینہ انور کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ انور نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہے۔ ہم فوراً

چیختے ہوئے پیچھے بھاگے، لیکن ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاؤں تلے زمین دھنس گئی ہے اور میں اس میں گر پڑا ہوں۔

اس کے بعد ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو خود کو ایک بوسیدہ سے کمرے میں پڑا پایا۔ اس میں دو صندوق کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اچانک ایک صندوق کا ڈھکنا آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ایک انسانی ڈھانچہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے دوسرے صندوق کا ڈھکنا بھی اوپر اٹھ گیا اور اس میں بھی ایک ڈھانچہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا دھواں آہستہ آہستہ ان ڈھانچوں میں بھرنے لگا۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ان ڈھانچوں کی جگہ اب انور اور سکینہ کھڑے ہیں۔ سکینہ نے انور کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا وہ مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے باہر لے جاتی۔ کوئی زوں، زاں کی آواز کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اف میرے خدا! یہ وہی عورت تھی جس کا چہرہ ہم نے اس رات دیکھا تھا۔ میری چیخ نکل گئی۔

جب ہوش آیا تو دیکھا، والد صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ رہے تھے۔ میں اور انور ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پڑے تھے جس میں چند انسانی ہڈیاں بھی تھیں۔ جب انور کو اٹھایا گیا تو وہ پاگلوں کی طرح ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ سکینہ سکینہ چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اسے پکڑتا، وہ اونچے ٹیلے سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ اور وہ ابدی نیند سو چکا تھا۔ شاید سکینہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ کہتے ہیں اس کے بعد میں مسلسل چار روز بے ہوش پڑا رہا۔ میں نے گاؤں کو خیر باد کہا اور سرگودھا چلا آیا۔ اب جب بھی گاؤں کا

کوئی آدمی ملتا، وہ بتاتا کہ ہر سال 20 جولائی کی رات کو جس جگہ سے ہم دونوں کو اٹھایا گیا تھا، آوازیں آتی ہیں۔ کوئی انور، انور پکارتا ہے۔ اس کے بعد شعلے رقص کرنے لگتے ہیں اور ان میں دو ہیولے نظر آتے ہیں۔ صبح شعلوں کے سرد ہوتے ہی ہیولے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔

﴿اے آر ملک﴾